غربت اور صدیق سالک کا ناول ''پریشر ککر''

ڈاکٹر مشتاق عادل

Dr. Mushtaq Adil

Assistant Professor, Department of Urdu,
The University of Lahore, Pakpattan Campus.

اللہ یار ثاقب

Allah Yar Saqib

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Lahore Garrison University, Lahore.

Abstract:

In this article, we discussed about the novel of Siddique Salik, who is a feminine novelist. In his novel Pressure Cooker, he depicted a clear picture of our society. He described many problems, which are faced by women like as harassment and forced them to bow. How the society cheat poor and illiterate people for their purposes and aims. Also, he described about the honest and genuine persons, how they faced hurdles in their lives regarding fib, fraud and hypocrisy based society.

ادبی دنیا میں شہرت حاصل کرنے والے بریگیڈیئر محمد صدیق سالک ۶ ستمبر ۱۹۳۵ء کو چودھری رحمت خان کے پیدا ہوئے۔ پیدائش کے تین سال بعد ان کے والد انتقال کر گئے۔ اکلوتا بیٹا اور تین بیٹیاں، جواں ہمت خاتون، سالک کی ماں نے محنت مزدوری کر کے اپنے ان بچوں کی پرورش کی۔ محنت اور ماں کی دعائیں صدیق سالک کو بریگیڈیئر کے عہدے پر لے گئیں۔ صدیق سالک نے میٹرک کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ زمیندارہ کالج سے ایف اے پاس کیا۔ ۱۹۵۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں بی۔اے آنرز پاس کیا۔ ۱۹۵۹ء میں انگریزی میں ایم اے پاس کیا اور ساتھ ہی اسلامیہ کالج فیصل آباد میں بطور استاد ملازمت کر لی۔ پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج مانسہرہ میں بطور لیکچرار تعینات ہوئے۔ بعد ازاں ''پاک جمہوریت'' کے نائب مدیر بنے۔ ایک سال بعد رسالہ بند ہو گیا تو اُن کو محکمہ اطلاعات و نشریات میں پی۔آر۔او مقرر کر دیا گیا۔

صدیق سالک ۱۹۶۴ء میں بطور کپتان فوج میں بھرتی ہوئے۔ ابتدائی ٹریننگ کے بعد وہ آئی ایس پی آر کے ہیڈکوارٹر میں فرائض سرانجام دینے لگے۔ ۱۹۷۰ء میں میجر کے عہدے پر ترقی ہوئی تو ڈھاکہ چلے گئے اور ۱۹۷۱ء میں ''سقوط ڈھاکہ'' کے

موقع پر جنگی قیدی بن گئے۔ دو سال بعد رہائی ملی۔ ۱۹۷۷ء میں لفٹیننٹ کرنل اور اسی سال کرنل بن گئے۔ ضیاء الحق کے دور حکومت میں پریس سیکرٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۷، اگست ۱۹۸۸ء، سانحہ بہاولپور، تک جاری رہا۔

صدیق سالک اپنی پہچان بطور ادیب زیادہ پسند کرتے تھے۔ انھوں نے بطور مزاح نگار شہرت حاصل کی مگر ان کا سنجیدہ ادب بھی اعلیٰ پائے کا ہے۔ ان کی تصانیف میں ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا''، ''ہمہ یاراں دوزخ''، ''سیلوٹ''، ''تادم تحریر''، ''ایمرجنسی'' اور معروف ناول ''پریشر ککر'' شامل ہیں۔ ''پریشر ککر'' صدیق سالک کا ناول ہے جس میں انھوں نے پاکستانی معاشرہ کے محروم طبقے کے مسائل کا عمدہ طریقے سے جائزہ لیا ہے۔ دوران ملازمت انھوں نے بیوروکریسی، اسٹیبلشمنٹ اور سیاست دانوں کے رویوں کا بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا اور ان کے ہاتھوں پس ماندہ طبقے کے ہونے والے استحصال کو اس ناول میں پیش کیا۔ اس ناول میں ان کی اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں:

''کہنے کو والد صاحب کے پاس تھوڑی سی زمین تھی اور وہ چودھری بھی کہلاتے تھے مگر یہ بارانی زمین تھی اگر بروقت بارش ہوگئی تو سبحان اللہ ورنہ نوبت فاقہ کشی تک پہنچ جاتی تھی۔''(۱)

اور اسی بات کا عکس ان کے ناول میں بھی نظر آتا ہے:

''فطرت ایک لائن مین کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ جسے لوگ منہ پر چوہدری کرم دین اور پیٹھ پیچھے کرموں لائن مین کہتے تھے۔''(۲)

ناول کا مرکزی کردار ایک مصور فطرت ہے۔ جسے اصول پسندی کی وجہ سے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فن کی ناقدری، مطلب پرستی اور مفادات کا حصول معاشرے کے وُہ تاریک پہلو ہیں جن کا پردہ مصنف نے بہت خوب صورت انداز میں چاک کیا ہے۔ ناول میں حب الوطنی کی کمی، لوٹ کھسوٹ کے کلچر، دفاتر میں گروہ بندی اور رشوت کے بل بوتے پر ٹھاٹ کی زندگی گزارنے والوں کے ساتھ ساتھ سیدھے سادے دیہاتیوں کے مسائل، مشکلات، توقعات اور دیہی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ہماری قومی زندگی کے اس المیے پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ ہم بہادری کے کارنامے سرانجام دینے والوں کو تمغہ دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی ہے حالانکہ اُن خاندانوں کی کفالت سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو خوف کی وجہ سے سمٹا ہوا ہے۔ ایک مغلوب طبقہ ہے جو اپنا حق بھی مانگتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پریشر ککر اس بات کی علامت ہے کہ انسان بے بس ہے وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم اور ناانصافی کو چپ چاپ سہتا ہے اور احتجاج بھی نہیں کرتا۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''یہ معاشرہ جس میں ہم سب رہتے ہیں اور رہنے کے لیے مجبور ہیں واقعی ایک پریشر ککر ہے۔ آس پاس اور گردوپیش میں جہنم کی سی آگ ہے۔ اس گرمی کی شدت سے افراد پگھل گئے ہیں اور اس سے باہر آنے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''(۳)

ناول میں پس ماندہ طبقہ کو تعلیم کی کمی کی وجہ سے پیش آنے والی مشکلات، قانونی الجھنوں اور افسر شاہی کے رویوں کی بھی عکاسی کی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس معاشرے میں سچے انسان، اصولوں کے پابند ملازم اور پیشے سے مخلص افراد کا انجام

کیا ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات ہمارا وہ رویہ ہے جس کے تحت ہم جسے چاہیں، کافر، غدار اور ایجنٹ قرار دے دیں کوئی قانون، ضابطہ، اخلاقی تقاضا یا ادارہ ہمیں اس الزام تراشی، کردار کشی اور گھٹیا رویہ پر گرفت میں نہیں لا سکتا۔

ناول میں کرموں لائن مین کے بارے میں بتایا گیا ہے جو ایک دوپہر کو کھمبے پر چڑھ کر تاریں ٹھیک کر رہا تھا کہ ایک نوجوان طالبہ کی پکار سن کر چونکا جو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ دو غنڈے اس کے پیچھے لگے تھے۔ کرموں نے لڑکی کی عزت بچانے کے لیے کھمبے سے چھلانگ لگائی اور غنڈوں کے پیچھے دوڑ پڑا۔ لڑکی کی عزت تو بچ گئی مگر حملہ آوروں کے ہاتھوں چاقو کے کاری وار لگنے سے کرموں جان کی بازی ہار گیا۔ ناول میں ہمارے قانونی سسٹم اور انصاف کے نظام کا بھی پردہ چاک کیا گیا ہے کہ دوسروں کی عزت بچانے والے لائن مین کی جان چلی گئی اور قاتلوں کو صرف دس سال سزا ہوئی:

> ''کرموں نے یک دم کھمبے سے چھلانگ لگا دی۔ ربڑ والا دستانہ نیچے پھینکا اور تاریں کاٹنے والے ہتھیار کے ساتھ غنڈوں کا مقابلہ کرنے لگا۔ وہ آپس میں گتھم گتھا تھے کہ کہیں سے ہارن کی آواز آئی۔ غنڈے اپنا شکار چھوڑ کر بھاگنے لگے تو کرموں نے ان میں سے ایک کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ دوسرے نے تیز دھار چاقو سے اس کی گردن کے پچھلے حصے پر زبردست وار کیا اور بھاگ گیا۔۔۔۔ لڑکی کی جان اور عزت بچ گئی۔۔۔۔ ڈاکو کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا اور کرموں کو نازک حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈاکو کو دس سال قید با مشقت سنائی گئی اور کرموں قیدِ حیات سے ہمیشہ کیلئے آزاد ہو گیا۔'' (۴)

ناول نگار نے دیہی زندگی کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ان پڑھ اور سیدھے سادے دیہاتی اپنی کم علمی کے سبب اکثر مشکلات کا شکار رہتے ہیں۔ چالاک اور مکار لوگ کسی ان پڑھ کی زمین ٹھیکے لینے کے نام پر کاغذات پر دستخط کرواتے ہیں تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ دستخط تو معاہدہ بیعہ پر کروائے گئے تھے۔ تعلیم کی کمی کے سبب ہی پٹواری اور تھانیدار معمولی باتوں پر انھیں لوٹ لیتے ہیں۔ بعض فراڈیے اپنا بن کر یوں دھوکا دیتے ہیں کہ رشتوں پر اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ ریشماں کو جب اپنے خاوند کرموں کی وفات پر محکمہ کی طرف سے گریجوایٹی اور دیگر مدات میں کچھ رقم ملی تو وُہ کسی حد تک مطمئن تھی کہ اس رقم سے اپنی بیٹی اور بیٹے کی پرورش کر لے گی مگر برادری کے لوگ اس بیوہ کے پاس اتنی رقم آنے پر حسد کرنے لگے۔ ایسے میں ہی ریشماں کے میکے سے ایک شخص سکندر ہمدرد بن کر آیا، اسے سبز باغ دکھا کر تمام جمع پونجی محفوظ بنانے اور دوسروں سے بچا کر رکھنے کا مشورہ دینے لگا:

> ''میری مانو تو زیور اور نقدی شہر کے بنک میں جمع کروا دو۔ بنک حکومت کی گارنٹی سے چلتے ہیں وہاں رقم بھی محفوظ رہے گی اور خرچے کے لیے سود بھی آتا رہے گا۔ آرام سے تمہارے بچے پل جائیں گے۔ فطرت بڑا ہوا یا ذکیہ بیٹی کی شادی کا وقت آیا تو اپنی رقم پوری یا آدھی نکلوا لینا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔۔۔۔۔ 'لیکن بھائی سکندر میں نے تو بنک کا منہ بھی نہیں دیکھا، مجھے ان جھمیلوں کا کیا پتہ کہ پیسے کیسے جمع کرواتے ہیں، گہنے کیسے بنک میں رکھتے ہیں، سود کیسے ملتا ہے میں تو ان پڑھ ہوں۔ بالکل ان پڑھ'۔۔۔۔ بہن اگر مجھ پر اعتبار کرو تو تمہاری خاطر

میں یہ کام کردونگا۔شہر میں میرا آنا جانا تو رہتا ہی ہے۔''(۵)

ریشماں پر مشکل وقت آیا تو رقم کے حصول کے لیے بنک گئی۔اُسے اکاؤنٹ نمبر تک معلوم نہ تھا۔چوہدری سکندر نے جعلی فارم پر ریشماں کے انگوٹھے لگوائے اور سب کچھ لے کر غائب ہو گیا۔وہ جب میکے گئی تو پتہ چلا کہ سکندر فراڈیا ہے اور کئی لوگوں کو پہلے بھی دھوکا دے چکا ہے۔اب اس کا کوئی پتہ نہ تھا اور شک یہ تھا کہ شاید وہ کراچی چلا گیا ہے۔

ناول نگار نے ہمارے معاشرے کے اس رویے کا بھی پردہ چاک کیا ہے اور بتایا ہے کہ غریب کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہوتا۔لوگ اپنے مفاد کی خاطر،خوف زدہ ہو کر یا تعلق واسطے کی وجہ سے لوٹ لیے جاتے ہیں۔ایک بیوہ جس کے پاس کچھ زمین اور گھر ہوا اُسے اس معاشرے میں لالچی لوگوں کی جانب سے قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔دوسرے تو دور کی بات اپنے حقیقی رشتہ دار ہی نہیں جینے دیتے۔کرموں کے فوت ہونے پر اُس کے بھائی شرفو نے بیوہ بھابھی اور یتیم بچوں کی مدد کرنے کی بجائے اُس کی جائیداد ہتھیانے کے لیے طرح طرح کے طریقے آزمائے اور اس کے لیے قدم قدم پر مشکلات کھڑی کر دیں۔اس کی فصل پر قبضہ کر لیا۔بے چاری مجبور عورت اور کر بھی کیا سکتی تھی:

> ''ریشماں نے ایک مرتبہ پھر گاؤں والوں کے ضمیر پر دستک دی تا کہ وہ شرفو کو ریشماں کا حصہ ادا کرنے پر رضامند کر سکیں لیکن کسی نے بھی شرفو سے ٹکر لینے کی حامی نہ بھری بلکہ انھوں نے بتایا کہ شرفو ہر کسی سے کہتا پھر رہا ہے کہ مرحوم بھائی کی جائیداد پر میرا حق ہے، میرا بھتیجا نابالغ ہے، جوان ہو گا تو دیکھا جائے گا۔اگر مجھے کچہری میں بھی جانا پڑا تو یہی بیان دونگا۔۔۔۔۔ریشماں نے سوچا کہ اگر گاؤں والے جن کی وہ بہو بیٹی ہے اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تو کچہری والے اس کے ساتھ کیا انصاف کریں گے۔جہاں گواہ چاہیئے ،اثر ورسوخ چاہیئے۔اگر اس کے پاس یہ تین چیزیں ہوتیں تو کچہری جانے کی کیا ضرورت تھی۔''(۶)

ناول میں اس تلخ حقیقت کو بھی آشکار کیا گیا ہے کہ موجودہ انتظامی ڈھانچے میں غریب کی آواز سننے والا کوئی نہیں۔ہر دفتر میں، ہر افسر کے پاس کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے درخواست گذاری جائے تو بغیر کسی سفارش یا رشوت کے شنوائی ممکن نہیں۔بے سہارا،غریب اور پس ماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے جتنی درخواستیں دے لیں ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔بے چارے ان پڑھ،سیدھے سادے دیہاتی جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے دربار میں درخواستیں بھیجنے کا سوچنے لگتے ہیں۔ریشماں بیوہ کیا ہوئی،مصیبتوں نے اُس کے گھر کا دروازہ دیکھ لیا۔جمع پونجی سے دھوکہ دہی کے ذریعے ہاتھ دھونا پڑا، زمین پر دیور نے قبضہ کر لیا اور بات یہیں پر ختم نہ ہوئی بلکہ اب اس کا دیور شرفو اسے مجبور کرنے لگا کہ وہ اس کے ساتھ نکاح کر لے۔دکھوں کی ستائی،مصیبتوں کی ماری، پریشانیوں میں گھری ریشماں آخر ایک دن گاؤں کے امام مسجد کے پاس جا پہنچی اور اُسے کہنے لگی کہ میں نے ایک درخواست لکھوا کر اللہ تعالیٰ کو بھیجنی ہے۔مولوی صاحب نے کہا کہ لوگ کپتان،ڈپٹی کمشنر،گورنر اور ایسے دیگر افسران کے نام عرضیاں بھیجتے ہیں اور تو خدا کے نام درخواست بھیجنے کے لیے آگئی ہے۔یہ گناہ ہے۔اس پر مظلوم ریشماں پھٹ پڑی اور کہنے لگی:

''میں نے ان سب کے نام درخواستیں بھیجی ہیں، میرے پاس ڈاک خانے کی رجسٹری کی یہ رسیدیں ہیں۔مگر ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔ کہتے ہیں جب تک درخواست کی پیروی نہ کی جائے کچھ نہیں بنتا۔ بھلا میری طرف سے پیروی کون کرے گا۔ میں بڑی مجبور اور لاچار ہوکر آپ کے پاس آئی ہوں۔آپ پانچوں وقت اللہ کا نام لیتے ہیں۔سارے گاؤں کو نماز پڑھاتے ہیں۔خدا کے واسطے میری درخواست اس تک پہنچا دو جس نے مجھے، آپکو اور ہم سب کو پیدا کیا ہے۔ وہ ہمیں پیدا کر کے کیوں بھول گیا ہے۔ کیوں بھول گیا ہے۔؟''۔۔۔''ایسا نہ کہو۔ یہ کلمہ کفر ہے۔''(۷)

ناول نگار نے ہمارے معاشرے کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ یہاں مردوں کو برتری حاصل ہے۔ایسی عورت جس کا کوئی سہارا نہ ہواُسے ہر وقت مرد بھوکے بھیڑے کی طرح دیکھ رہے ہوتے ہیں اور اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ریشماں کے بچوں کو جب کھانے کو کچھ نہ ملا، جو کچھ پاس تھا اُس سے محروم کر دی گئی تو مولوی نے جو تجویز دی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔نہ کوئی افسر پارسا ہے اور نہ کوئی سیاست دان، نہ کوئی جاگیردار اور نمبردار، نہ کوئی مولوی یا امام مسجد سارے مرد خود غرض، بے حس، مطلب پرست اور حریص ہیں اور مولوی صاحب نے یہ بھی ایک ایسی عورت کو جس کے خاوند نے ایک نیک کام کے لیے، ایک معصوم دوشیزہ کی عزت بچانے کے لیے جان دی تھی اُس کے تین دنوں سے بھوکے بچوں کی بھوک مٹانے کے لیے یوں مشورہ دیا:

''بچوں کی بھوک کا بھی علاج ہو سکتا ہے۔۔۔' اللہ تیرا بھلا کرے۔جلدی بتا۔ جلدی'۔۔۔'عقد ثانی کرلو'۔۔۔وہ کیا ہوتا ہے'۔۔۔'دوسرا نکاح'۔۔۔'کس سے' ۔۔۔'جس سے چاہو..... ویسے میں بھی نیکی کرنے کو تیار ہوں۔''(۸)

''پریشر ککر'' میں صدیق سالک نے پس ماندہ طبقے کے مسائل کو اجاگر کرنے کی بہترین کاوش کی ہے۔ناول نگار نے واضح کیا ہے کہ بلاشبہ حکومت کی جانب سے ملنے والے اعزازات اور تحفے عزت واحترام کا باعث ہوتے ہیں مگر یہ اعزازات دینے والے اداروں، افسروں اور حکمرانوں کو چاہیے کہ ایسے گھرانوں کی کفالت کا مستقل بنیادوں پر انتظام کیا جائے۔جس گھر میں غربت ہو۔جس خاندان کا واحد کفیل کسی اعلیٰ مقصد کے لیے جان دے چکا ہو اُس گھر میں پڑا میڈل یا تمغہ ان کی مالی مشکلات حل نہیں کرسکتا۔ریشماں جسے اُس کے شوہر کے کارنامے کے عوض تمغے سے نوازا گیا۔سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے کراچی پہنچی اور صدر مملکت سے تحفہ وصول کیا، واپس آ کر اُس نے یہ تحفہ بہت سنبھال کر رکھا مگر ایک وقت ایسا آیا کہ اُس کے بچے فاقے کرنے پر مجبور ہوگئے تو بے بس ماں یہ برداشت نہ کرسکی اور اُس نے چپکے سے تمغے والی ڈبیا اٹھائی اور فیصل آباد یہ تمغہ فروخت کرنے کے لیے پہنچ گئی:

''وہ ایک صراف کے پاس گئی، بغل میں سے خوبصورت ڈبیا نکال کر اسے دکھائی اور کہا 'بھائی اس تمغے کا جو کچھ بنتا ہے مجھے دے دو، مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے'۔۔۔سنار نے ایک نظر تمغے کو دیکھ کر کہا۔۔۔'بی بی یہ تانبے کا ہے اس کا کچھ نہیں مل سکتا'۔۔۔ یہ کہہ کر اس

نے تمغہ ریشماں کو واپس کر دیا۔ ریشماں کا جی چاہا کہ اسے نالی میں پھینک دے، ایسے تمغے کا کیا فائدہ جو نہ اس کی بھوک مٹا سکتا ہے نہ اس کے مصائب کو کم کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ سوچ کر اس نے ڈبیہ کو دوبارہ بغل میں چھپا لیا۔'' (۹)

ناول نگار نے ہمارے معاشرہ میں غریبوں کے مسائل کا تذکرہ کرتے ہوئے ملک میں رائج انگریز کے قانون کے تاریک پہلوؤں کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس قانون کے تحت اگر آپ کسی پٹواری کے خلاف تحصیلدار، اسسٹنٹ کمشنر یا ڈپٹی کمشنر وغیرہ کو درخواست دیتے ہیں اور آپ کی دادرسی نہیں ہوتی تو آپ وزیر، وزیرِ اعلیٰ یا گورنر کو درخواست دیتے ہیں تو وہ آپ کی درخواست پر کمشنر سے رپوٹ طلب کرتا ہے۔ کمشنر ڈپٹی کمشنر کو لکھتا ہے اور ڈپٹی کمشنر اسٹنٹ کمشنر سے رپورٹ مانگتا ہے۔ اسٹنٹ کمشنر متعلقہ علاقہ کے تحصیلدار سے رپوٹ پوچھتا ہے تو تحصیلدار گرداور حلقہ سے رپورٹ طلب کرتا ہے اور گرداور حلقہ اُسی پٹواری کو لکھتا ہے کہ واقعہ کی رپورٹ لکھ کر دو۔ اب وُہ پٹواری اپنے خلاف کیا لکھے گا۔ ایک دو لوگوں کی فرضی گواہی ڈال کر وہ رپورٹ گرداور کو بھیجتا ہے جو تحصیلدار اور اسسٹنٹ کمشنر سے ہوتی ہوتی ڈپٹی کمشنر تک جاتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر پورٹ کمشنر کو بھیجتا ہے جو متعلقہ افسر تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ پولیس افسر کے خلاف درخواست اعلیٰ حکام کو بھیجتے ہیں تو اُس کی رپورٹ بھی متعلقہ پولیس افسر کے ہاتھ سے افسران بالا تک جاتی ہے۔ اس نظام کا نقصان یہ ہے کہ کوئی اہلکار خواہ وُہ پٹواری ہو یا تھانیدار جتنا بھی بدعنوان اور رشوت خور ہو اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیوں کہ وُہ اپنی رپورٹ میں اپنے آپ کو بے گناہ اور درخواست گذار کو جھوٹا لکھ دیتا ہے۔ ایک روز جب فطرت اپنے دوست ارشد کو اپنے حالات بتا رہا تھا تو ارشد نے سوال کیا کہ آپ کی بہن کو اغواء کرنے والوں کا کیا بنا۔ اس پر فطرت نے جو کچھ بتایا وُہ ہماری انتظامیہ کی نااہلی کا پردہ چاک کرنے کے لیے کافی ہے:

''ذکیہ کو غنڈے اُٹھا کر لے گئے بھرے بازار سے۔ پھر کیا ہوا؟۔۔۔۔'ہونا کیا تھا، ذکیہ کو واپس ملنا تھا، نہ ملی'۔۔۔۔'اور شیخ صاحب نے بھی کچھ نہ کیا'۔۔۔۔'ان سے جو کچھ ہو سکتا تھا انھوں نے کیا، مجھے ساتھ لے کر کئی مرتبہ ایس۔ پی صاحب کے پاس گئے، وزیر اعلیٰ، آئی۔ جی پولیس اور گورنر صاحب کو تار بھجوائے'۔۔۔۔'ان تاروں کا کچھ اثر ہوا'۔۔۔۔'اثر کیا ہوتا۔ وہ تاریں گھوم پھر کر دوبارہ اُسی ایس۔ پی اور اُسی تھانے دار کے پاس پہنچ جاتیں اور وہ اپنا بنا بنایا جواب بھیج کر کاروائی پوری کر دیتے۔'' (۱۰)

ناول نگار نے ہمارے ہاں موجود الزام تراشی کے کلچر کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ہمارے معاشرے میں معمولی بات پر کسی شخص کو کافر، غدار یا غیر ملکی ایجنٹ قرار دے دینا عام سی بات ہے۔ سیاسی جماعتیں اسی بنیاد پر بلند و بانگ دعوے کرتے ہوئے غریب عوام کی قسمت بدلنے کے وعدے کرتی آئی ہیں مگر بدقسمتی سے غربت، بے روزگاری اور بدامنی جیسی مشکلات کا خاتمہ نہ دائیں بازو کے سیاسی نظریات رکھنے والے کر سکے اور نہ ہی بائیں بازو کی سیاست کے دعوے دار۔ فطرت نے غربت دیکھی تھی۔ اُس کے باپ کو قتل کر دیا گیا، اُس کی بہن اغوا ہوگئی، جائداد پر چچا نے قبضہ کر لیا۔ ماں نے شیخ رفیق کے گھر میں برتن دھو کر اُسے پڑھایا۔ یونیورسٹی میں جب پینٹنگ کے لیے کوئی موضوع زیرِ بحث آیا تو اُس نے غربت اور معاشی ناہمواری پر برش اٹھانے کی بات کی کیونکہ وُہ اس بھٹی سے گذر چکا تھا۔ یونیورسٹی ٹاپ کرنے والے کو ہمیشہ ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار بھرتی کر لیا جاتا تھا مگر

فطرت کو پروفیسر سعید نے بتایا کہ تمھیں نوکری نہیں ملے گی کیوں کہ تمھارے بارے میں مسز شیخ کی رائے یہ ہے:

> ''وہ سمجھتی ہیں کہ تمھارا تعلق سُرخوں سے ہے اور حکومت آج کل سُرخوں کی پکڑ دھکڑ کر رہی ہے۔اسے ڈر ہے کہ تمھیں یونیورسٹی میں ملازمت دینے سے کہیں اس کی ملازمت میں توسیع خطرے میں نہ پڑ جائے'۔۔۔۔'لیکن سر، میرا سُرخوں سے کیا تعلق'۔۔۔۔'مسز شیخ کا کہنا ہے کہ دو سالوں میں تم مختلف بحثوں میں جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ہو جس طرح کے کینوس پینٹ کرنے کی خواہش کرتے رہے ہو اور ٹی ہاؤس اور حلقہ ادب میں جس قسم کے ادیبوں اور دانشوروں سے ملتے رہے ہو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تمھارا رجحان، لیفٹ (بائیں بازو) کی طرف ہے اور اس نظریاتی مملکت کے لیے اشتراکی نظریہ اور اس سے ہمدردی سم قاتل ہے۔''(۱۱)

ناول میں لوگوں کے اہم مسئلہ غربت کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔دیہی علاقے کے غریب مکین روپیہ روپیہ بچا کر اپنی دو وقت کی روٹی پوری کرتے ہیں انھیں اپنی روٹی کی فکر ہوتی ہے اس لیے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔اس طرح امیر لوگوں کو روزی روٹی کی فکر نہیں ہوتی وُہ زیادہ تر اپنے چونچلوں کے متعلق سوچتے ہیں اور وہ بھی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں مگر ہمارے معاشرے میں موجود متوسط طبقہ اخلاقی اقدار کی گرفت میں ہے۔اس طبقہ میں بات سننے اور سہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا ہے۔جب فطرت کا سامان صرف اس لیے جلا دیا گیا کہ اُس نے علاقے کے چوہدری کا گیٹ رنگ نہیں کیا تھا تو وُہ پریشان ہو کر پروفیسر سعید کے پاس پہنچا اور اپنی بپتا سنائی۔پروفیسر سعید نے اُسے مشورہ دیا کہ اس کام کے لیے وُہ یا تو لاہور کے پوش علاقے میں رہائش اختیار کر لے یا پھر جہاں غریب لوگ رہتے ہیں۔اُس نے امیر، متوسط اور غریب طبقہ کی اقدار پر بات کرتے ہوئے غریبوں کے حوالے سے بتایا:

> ''آپ نے دیہات اور شہر میں دیکھا ہوگا کہ غریب طبقے کی عورتیں اور مرد ایک ہی تانگے میں ٹھونسے ہوتے ہیں۔ایک مرد کی ٹانگ کسی غیر محرم عورت کی ران سے جڑی ہوتی ہے۔ ایک کی کہنی دوسرے کے سینے کو چھو رہی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات ایک سانس دوسرے کو محسوس ہو رہا ہوتا ہے لیکن دونی دونی کرایہ دے کر گھر پہنچنے کی خاطر سب کچھ برداشت کر جاتے ہیں۔۔۔''(۱۲)

ناول نگار نے ہمارے رویوں پر کڑی تنقید کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ غریبوں کا کوئی ہمدرد نہیں اور امیروں سے ہر ایک شخص راہ و رسم بڑھانا چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں عزت کا معیار دولت ہے۔کوئی شخص کتنا ہی، متقی، پرہیز گار یا تعلیم یافتہ ہو اگر اُس کے پاس دولت نہیں تو اُس کی تمام خوبیاں بے کار ہیں۔اسی طرح دولت مند شرابی، زانی اور رسہ گیر لوگوں کے نام کے ساتھ چودھری، خان اور ملک کے اضافے کر دیے جاتے ہیں جبکہ غریب کا نام بھی کوئی سیدھا نہیں پکارتا۔دیہی کلچر میں خاص طور پر یہ قابل مذمت رویہ عام ہے۔فطرت جب شہر کے مسائل، مشکلات اور پریشانیوں سے گھبرا کر گاؤں کی فضا میں جا کر امان طلب کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہاں بھی اُسے سکون میسر نہیں آپاتا:

''گاؤں والوں کے رنگ بھی نیارے ہوتے ہیں۔لحہ بھر میں رتی اور لحہ بھر میں ماشہ۔فطرت کا باپ صاحب حیثیت تھا تو چوہدری کرم دین تھا اور جب اس کی مالی حالت خراب ہوگئی تو سب اسے کرموں لائن مین کہنے لگے۔ جب تک وہ زندہ رہا تو غریبی اور امیری دونوں حالتوں میں کچھ نہ کچھ اس کا دید لحاظ رہا۔ جب فوت ہو گیا تو فطرت ، ذکیہ اور ریشماں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ پندرہ سال کی محنت و مشقت کے بعد جب فطرت جوان ہوکر اپنے آبائی گھر لوٹا گاؤں والوں نے اسے آنکھوں پر بٹھایا۔ وہ امریکہ سے پلٹا تو مستقبل کی توقعات کے گرویدہ لوگوں نے تعریفیں کرکے اسے آسمان پر چڑھا دیا۔'' (۱۳)

میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں اوران میں ایک بھی اپنا کام پوری ذمہ داری سے نہ کرے تو گھر میں پریشانی ختم نہیں ہوتی ۔خاوند باہر کے حالات کا ستایا گھر آئے تو سمجھدار بیوی اُس کو حوصلہ دیتی ہے جس سے اس کی آدھی پریشانی ختم ہو جاتی ہے جبکہ کم عقل بیوی پریشان شخص کو مزید پریشان کر دیتی ہے۔فطرت جیسا فنکار جس نے ساری زندگی اصولوں پر سمجھوتہ نہ کیا اور محنت مشقت سے مشکل حالات کا مقابلہ کر کے زندگی کی گاڑی کھینچتا رہا اس کو اپنی بیوی زبیدہ کے رویے سے ایسی ہی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بجائے اس کے کہ وُہ فطرت کی حق حلال کی کمائی پر فخر کرتی اُسے طرح طرح کی فرمائشیں کر کے پریشان رکھنے کا سبب بنتی رہی ۔ناول میں ہماری معاشرتی زندگی کے اس رخ سے بھی پردہ اٹھایا گیا ہے کہ رشوت خور اور ناجائز کمائی کرنے والوں کے مقابلے میں اصول پسند اور تنخواہ پر گذارہ کرنے والے کو گھر، باہر سے کتنی مشکلات پیش آتی ہیں:

''ساتھ ایس ڈی او صاحب کا گھر دیکھ لو، ادھر سیکشن آفیسر کا گھر دیکھ لو سامنے فاریسٹ آفیسر کا گھر دیکھ لو۔ دس دس ہزار کا صوفہ سیٹ پڑا ہے۔ بیٹھک میں ،صوفے پر ریشمی کپڑے کی گدیاں رکھی ہیں اور گدیوں پر سندھی کام کیا ہوا ہے۔ ہر گھر قالین ہے۔ ہر بیڈ روم میں پلنگ بچھے ہیں ۔۔۔ اپنے لیے بھی اور مہمانوں کے لیے بھی ۔۔۔ پھر چائے کی ٹرالی، جاپانی ٹی سیٹ، ڈنر سیٹ، کافی سیٹ اور پتہ نہیں کیا کیا سیٹ، میں تو کسی سہیلی کو اپنے گھر آنے کو بھی نہیں کہہ سکتی۔'' (۱۴)

ناول نگار نے اس حقیقت کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے معاشرے میں حقیقت پسندی نام کی کوئی چیز نہیں ۔ سچی بات کرنے والے کی حوصلہ افزائی کی بجائے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔کوئی غریبوں کی بھلائی کی بات کرے تو اُس پر کمیونسٹ ہونے کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے حالانکہ اسلام تمام مذاہب ،عقیدوں اور فلسفوں سے بڑھ کر انسانی حقوق کا علمبردار ہے اور ہمارا معاشرہ اسلامی معاشرہ ہونے کا دعویدار ہو کر بھی اس طرف توجہ نہیں دیتا۔ فطرت کو ایک ادبی تقریب میں شعیب صدیقی کے افسانے پر ہونے والی تنقیدی نشت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ افسانے میں مرکزی کردار مراد کی زندگی کو افسانہ نگار نے یوں دکھایا کہ اُس کی ماں کی وفات کے بعد زمیندار باپ نے دوسری شادی کر لی اور اس طرح مراد ماں اور باپ دونوں کی شفقت سے محروم رہ گیا اور باقی زندگی مراد کو زمانے کے تھپیڑے سہنے پڑے۔ حاضرین نے افسانہ نگار پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اُسے اشترا کی خیالات کا مالک اور سرخہ قرار دیا مگر فطرت جس نے زمانے کے تھپیڑے کھائے تھے اور اسے بھی انھیں خطابات سے نوازا گیا تھا

اٹھااور یوں گویاہوا:

''آپ میرے خلاف جو چاہیں کہیں اور جس طرح چاہیں محاسبہ کرائیں لیکن مجھے ایک بات بتائیے: کیا سماجی انصاف کی بات کرنا کمیونزم ہے یا عین اسلام؟ کیا معاشرے میں غربت، افلاس، جبر، تشدد اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھانا اشتراکیت ہے یا سماجی جہاد؟ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق محض اس لیے سلب کر لے کہ وہ طاقتور ہے۔ دولت مند، ہے، بااثر ہے؟ کیا اسلام اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ معاشرے کا ایک طبقہ تو گڑیوں کی شادی پر لاکھوں روپے خرچ کردے اور دوسری طرف غریب بچیاں جہیز کے انتظار میں بوڑھی ہو جائیں؟۔ کیا یہ واقعی اسلام کی خدمت ہے کہ ہم خود صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوۃ وعشر ادا نہ کریں لیکن دوسروں پر کفر کے فتوے صادر کرتے رہیں۔ صاحب صدر! میرے خیال میں ہمیں یہ احتیاط کرنی چاہیے کہ ہم سماجی بھلائی کی ہر کوشش کو کمیونزم یا اشتراکیت کے کھاتے میں نہ ڈالیں۔''(۱۵)

بلاشبہ صدیق سالک نے بڑی جرات اور بہادری کے ساتھ ہمارے معاشرے میں سچے، اصول پسند اور محبّ وطن لوگوں کے لیے قدم قدم پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں کی عکاسی کی ہے۔ فطرت جیسے فنکار نے ایک دور افتادہ بستی میں تصویریں بنا کر روزی کمانے کی کوشش کی تو سب کچھ جلا دیا گیا، اُس نے ایک اشتہاری کمپنی میں ملازمت کی تو اپنے اصولوں کی بھینٹ چڑھ گیا اور آخر کار سرکاری ملازمت ملی بھی تو اُس پر دشمن کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا کر نوکری سے فارغ کر دیا گیا اس ظالم سماج کے رویے نے ایک سچے فن کار کو پاگل بنا دیا اور اس نے اپنے تمام فن پارے جنگل میں جا کر جلا دیے اور خود بھی کہیں گم ہو گیا۔ ''پریشر ککر'' کے حوالہ سے ممتاز نقاد ڈاکٹر افضال بٹ کی رائے ہے:

''ناول کا مرکزی کردار آزاد فکر فنکار فطرت ہے۔ وہ اپنے نظریات کا پرچار آزادی کے ساتھ اپنے تصادم کی صورت میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کی فکر پر قدم قدم پر پابندیاں اسے دیوانہ بنا دیتی ہے۔ مصنف نے فطرت کے کردار کے ذریعے پاکستانی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔''(۱۶)

''پریشر ککر'' پاکستانی اردو ناولوں میں اہم ناول ہے۔ یہ ناول معاشرے کے ہر افراد کی کہانی ہے۔ ہر وہ فرد جو ہمارے اردگرد ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ حسین لکھتے ہیں:

''اس (پریشر ککر) میں ہمارے اردوگرد کے افراد کے چہرے صاف نظر آتے ہیں۔ ناموں کو تھوڑا سا بدل دیا جائے تو وہ اصل روپ میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔''(۱۷)

ناول میں تعلیم کی کمی، غربت، مذہبی انتہا پسندی، تعصب، خودغرضی اور افسر شاہی کی چالوں سمیت ملک کی کثیر آبادی پر مشتمل غریب طبقہ کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دیہی ماحول میں زندگی کی ابتدا کرنے والے فطرت کو شہر میں بھی قدم قدم پر مشکلات پیش آتی ہیں مگر وُہ ان کا مقابلہ کرتا رہتا۔ ظالم سماج اس کو اتنا پریشان کرتا ہے کہ ایک سچا فنکار، مخلص

پاکستانی اور اسلامی تعلیمات پر پختہ ایمان رکھنے والا یہ شخص آخر کار اپنی سوچوں خیالات اور نظریات کو جو پینٹنگز کی شکل میں تھے جلا دیتا ہے اور خود پاگل ہو جاتا ہے۔

ناول میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ ہم سچ سننے کے عادی نہیں۔ دوسروں پر الزامات لگانا اور اپنی غلطیوں کوتاہیوں کو چھپانا ہمارے معاشرے میں ناسور کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سرکاری دفاتر، ہسپتالوں اور اداروں میں لوگ اپنی نوکریاں بچانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ چاپلوسی اور خوشامد کرنے والے لوگ کامیاب ہیں اور سچی بات کرنے والے اصول پسند شخص کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول اردو ادب کے اُن چند ناولوں میں سے ایک ہے جس میں پس ماندہ طبقہ کے مسائل کی عمدہ طریقے سے نشان دہی کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱ مقبول جلیس، انٹرویو، مشمولہ: سیلف میڈ لوگ، کراچی: فضلی سنز، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۹

۲ صدیق سالک، پریشر ککر، لاہور: الفیصل ناشران، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۱۳ء، ص: ۱۰

۳ عبادت بریلوی، ادبی مذاکرہ، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء

۴ صدیق سالک، پریشر ککر، ص: ۱۵

۵ ایضاً، ص: ۲۱

۶ ایضاً، ص: ۲۳

۷ ایضاً، ص: ۲۸

۸ ایضاً، ص: ۲۸

۹ ایضاً، ص: ۲۹

۱۰ ایضاً، ص: ۵۶

۱۱ ایضاً، ص: ۱۳۴

۱۲ ایضاً، ص: ۲۲۳

۱۳ ایضاً، ص: ۲۶۸

۱۴ ایضاً، ص: ۲۸۳

۱۵ ایضاً، ص: ۳۱۳

۱۶ محمد افضال بٹ، اُردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص: ۳۴۳

۱۷ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ادبی مذاکرہ، مشمولہ: جنگ، روزنامہ، لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۳ء

☆......☆......☆